بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اشتیاق احمد ظلی

۶ر دسمبر ۹۲ء ظلم وجبر کی تاریخ کا سیاہ باب۔ ہندوستان کی پیشانی پر رسوائی کا داغ جسے ملک کے سارے 'پوتر' دریاؤں میں بہنے والا پانی بھی دھونے سے قاصر۔ جس دن پنجۂ استبداد نے صدیوں کی تاریخ کو صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا جیسے کبھی اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ہندو جارحیت کے ہاتھوں بابری مسجد کی شہادت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جو مستقبل کی سمت کا پتہ دیتا ہے اور جس سے تاریخ کے رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ بابری مسجد کے گرتے ہوئے در و دیوار کے نیچے جمہوریت، انصاف، قانون کی بالادستی اور دستور کی حکمرانی سب کچھ دفن ہو گیا، وہ اقدار پامال ہو گئیں جن پر اس ملک کی نظریاتی اساس قائم تھی۔ اور ایک نئے طرز فکر نے جنم لیا جو صرف طاقت کی زبان جانتا اور سمجھتا ہے اور جس کی نظریاتی اساس صرف جذبۂ نفرت پر قائم ہے۔ چنگیز و ہلاکو کے ہاتھوں پہلے بھی بارہا قبائے انسانیت تار تار ہو چکی ہے لیکن چشم فلک نے ایسا منظر شائد اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو جب انسانوں کا اتنا بڑا ہجوم اتنی منصوبہ بندی اور تیاریوں کے ساتھ ایک بوسیدہ و شکستہ عمارت پر حملہ آور ہوا ہو جس کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا اور حکومتِ وقت اس جارحیت کے خلاف ایک انگلی بھی اٹھانے والی نہ تھی۔ یقیناً اس بہادری کی مثال تاریخ عالم میں ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے بیان کا یارا کسے ہے۔ گذشتہ دو تین مہینوں کے دوران اس ملک کے مسلمانوں کے سر سے جو جوئے خون گذر گئی اس کی قہرمانی اور ہلاکت خیزی کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔ کچھ بھی تو باقی نہ بچا جو ہمیں عزیز تھا، جسے ہم جانتے تھے، پہچانتے تھے اور جس سے زندگی میں حسن تھا، رعنائی تھی، جس سے خود زندگی عبارت تھی۔ یہ سیلِ بے اماں

سب کچھ بہا لے گیا، صدیوں سے ساتھ رہنے سہنے کی ریت ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کی روایت، مشترکہ تہذیبی اقدار، تمدنی رشتے، تاریخی ورثہ سب نفرت کے دیوتا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اور یہ سب کچھ اس دیش میں ہوا جو اہنسا کی سرزمین کہلاتی ہے۔

بابری مسجد کی شہادت اور اس کے جلو میں آنے والی ہلاکت خیزی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ یہ تاریخ کا ایسا نازک موڑ ہے جہاں غلط فیصلے جان لیوا بن جاتے ہیں اور صحیح فیصلہ کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟ یہ بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس وقت کیا فیصلے کرتے ہیں اور ان پر کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ ہمارا رخ اگر صحیح ہوگا، فیصلے درست ہوں گے اور پورے اخلاص سے ان کو روبعمل لانے کی کوشش ہوگی تو انشاء اللہ سفینہ ملت ساحل مراد تک ضرور پہنچے گا۔

ہندوستان میں مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کے اسباب وعلل کے بارے میں دانشوروں کے درمیان مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر اس کے اسباب مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ مسلمانوں میں سیاسی شعور کے فقدان کو اس کا ذمہ دار بتاتے ہیں چنانچہ کسی مخصوص لیڈر یا پارٹی کی ہمنوائی کو اس کا علاج گردانتے ہیں۔ ہم نہ تو ناشکر گذار ہیں اور نہ حالات کے نشیب وفراز سے یکسر بے خبر جن افراد، لیڈروں اور جماعتوں نے اس پر آشوب دور میں سچی بات کہنے کا حوصلہ کیا، سچائی کے لیے سینہ سپر ہوئے اور ہماری دادرسی کے لیے آئے ہم ان کے ممنون کرم ہیں اور دل کی انتہائی گہرائیوں سے ان کے شکر گزار۔ وہ اس دیش کی آبرو ہیں۔ ان کے دم سے انسانیت کا پرچم یکسر سرنگوں ہونے سے بچ گیا اور بلاشبہ یہ وقت کی بڑی ضرورت ہے کہ ایسے عناصر سے بھرپور تعاون کیا جائے اور ان کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود یہ مسلمانوں کے مسائل کا مستقل حل نہیں ہے۔ عمارت کی جڑیں اگر کمزور ہو جائیں تو باہر سے رنگ وروغن سے اس کا علاج ممکن نہیں۔ بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کے مسائل کا حل ان کے باہر نہیں ان کے اندر ہے۔

مسلمانوں کے ساتھ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کی طرح صرف ایک قوم

نہیں ہیں بلکہ ایک نظریاتی قوم ہیں۔ ان کا ایک تاریخی تشخص اور کردار ہے۔ ان کے وجود کا ایک مقصد، نصب العین اور مشن ہے۔ جب وہ اس بنیادی کردار کے خلاف طرزِ عمل اپناتے ہیں اور ایسے طور طریقے اختیار کرتے ہیں جس سے اس مقصدِ حیات کی نفی ہوتی ہے تو لاینحل مسائل جنم لیتے ہیں۔ جو علاج دوسری قوموں کے آزار کے لیے تیر بہدف ثابت ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کے کے لیے سود مند نہیں ہوتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ دوسروں کی طرح صرف مادی ترقی اور خوشحالی کے اسباب و وسائل کی تلاش و جستجو ان کے فکر و عمل کی معراج نہیں ہے۔ ان کا مقصدِ حیات اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ جب مسلمانوں کی زندگی اس عظیم مقصد سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو رفعتِ افلاک بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے اور جب وہ اس مقصد سے روگردانی کرتے ہیں تو ان کی حیثیت گردِ راہ کی بھی نہیں رہ جاتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کا عروج و زوال اس بنیادی مشن کے ساتھ ان کی وفاداری یا اس سے دوری سے براہِ راست جڑا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کی سربلندی اور سرفرازی کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران: ۱۳۹)	اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن ہو۔

ظاہر ہے اس سے مراد ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ ابن خلدون نے عربوں کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی ترقی کے لیے دین سے وابستگی ضروری ہے۔ دین سے دوری کی حالت میں ان کی جبلت کے تخریبی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں جن سے بے شمار برائیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ بات پوری امتِ مسلمہ پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کی نجات و ترقی سب کچھ اس امر پر منحصر ہے کہ دین سے ان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ وہ سب کچھ حاصل کر لیں، سب کچھ بن جائیں لیکن اگر دین سے ان کا تعلق کمزور ہے اور وہ 'پورے مومن' نہیں ہیں تو ان کو اقوامِ عالم کے درمیان سربلندی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ چیزیں دوسروں کے لیے معراجِ کمال ہو سکتی ہیں لیکن امتِ مسلمہ کی معراجِ کمال تو یہی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں امتِ وسط بن جائے اور اس کے افراد اس ابدی پیغام کی جیتی جاگتی تصویر بن جائیں جو کتاب اللہ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ہماری زبوں حالی اور افتراق کی سب سے بڑی وجہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے دوری ہے۔ ہم نے قرآن مجید کو صرف ایک تبرک کی چیز سمجھ لیا ہے جس کا ہماری زندگی سے عملاً کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انسانیت پر خالق کائنات کا سب سے بڑا انعام جس نے دنیا کو عظیم ترین انقلاب سے روشناس کیا، جس نے انسانیت کو بے آمیز توحید الٰہی اور وحدت آدمیت کی لازوال دولت سے ہمکنار کیا، جس نے انسان کو ہر طرح کے خداؤں کی پرستش کے بندھن سے آزاد کیا، جس نے دنیا کے مظلوموں اور مجبوروں کو امن وعافیت اور دونوں جہاں کی فائز المرامی کی نوید سنائی اس انقلاب آفریں کتاب کے حامل اس ذلت و رسوائی میں گرفتار اور سارے عالم کی انگشت نمائی کا ہدف ہوں۔ اس سے زیادہ عبرت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔ سبب ظاہر ہے۔ اس نسخہ کیمیا کی اثر پذیری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہمیں نے اس کو چھوڑ دیا، اس کے پیغام سے دست کش ہو گئے، اس کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ گئے اور عملاً اسکی تعلیمات سے دور جا پڑے۔ بارگاہ رب العزت میں رسولؐ کی شکایت کیا ہمارے اوپر صادق نہیں آتی:

وَقَالَ الرَّسُولُ يَارَبِّ إِنَّ قَوْمِي	اور (اس دن) رسولؐ کہیں گے کہ اے میرے
اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُورًا	پروردگار میری (اس) قوم نے اس قرآن
(فرقان: ۳۰)	کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔

چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کتاب اللہ سے اپنا تعلق مضبوط کریں، اس پر غور وفکر کی عادت ڈالیں، اس کے مطالعہ کے لیے حلقے بنائیں، اس کے پیغام کو عام کریں، اس کی تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں جاری وساری کرنے کی سعی کریں، اس کے بتائے ہوئے خطوط پر، جن کی تفصیل وتوضیح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور آپ کی سنت میں محفوظ ہے، اپنے معاشرہ کی تعمیر وتشکیل کرنے کی جدوجہد کریں اور اپنے جملہ مسائل کا حل اسکی روشنی میں تلاش کریں۔ اس کے بعد ہی ہم اس عزت وسربلندی کے حقدار ہوں گے جسکی بشارت قرآن مجید نے دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کتاب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو سربلندی سے سرفراز کرے گا اور کچھ دوسروں کو ذلت ورسوائی سے ہمکنار (ان اللہ یرفع بھذا القرآن اقواماً ویضع آخرین) اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جنکو اس نے قرآن کے ذریعہ سرخرو کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ آمین!

۱۵ مارچ ۹۳ء